امام حسن مجتبیٰ ؑ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

ولادت: ۱۵؍رمضان ۲ھ بمقام مدینہ منورہ

وفات: ۲۸؍صفر ۵۰ھ محل دفن جنۃ البقیع مدینہ منورہ

امام حسن ؑ کی ولادت ۲؍ہجری یا ۳؍ہجری میں ہوئی۔ رسولؐ کی وفات کے وقت ساتواں یا آٹھواں برس تھا اوران کی یہ عمر پوری پیغمبرؐ خدا کے غزوات کی عمر ہے۔ ۲؍ہجری میں جنگ بدر ہوئی اوراس کے بعد ان کی عمر کے ساتھ غزوات کی فہرست آگے بڑھی۔ جس طرح علیؑ کی پرورش پیغمبر کی گود میں تبلیغ اسلام کے ساتھ ویسے ہی حسن مجتبیٰ کی پرورش رسولؐ کی گود میں رسولؐ کے غزوات اور اپنے والد (حضرت علیؑ مرتضیٰ) کے فتوحات کے ساتھ۔ ان کے بچپن کی کہانیاں اورسوتے وقت کی لوریاں گویا یہی تھیں کہ علیؑ کسی جہاد سے واپس آئے ہیں۔ حضرت فاطمہ زہراؑ سے تذکرہ ہو رہا ہے خندق میں یہ ہوا۔ یہ تذکرے کانوں میں پڑرہے ہیں اورآنکھیں جودیکھ رہی ہیں وہ یہ کہ دشمنوں کے خون میں بھری ہوئی تلوار ہے اورسیدۂ عالمؑ اسے صاف کررہی ہیں۔ پیغمبرؐ کے ارشادات بھی گوش زد ہورہے ہیں کبھی معلوم ہوا آج نانا نے والد بزرگوار کے لئے کہا:

ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَومَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَين۔ کبھی سنا کہ فرمایا: لَاُعْطِيَنّ الرَّايَةَ غدًا رَجُلًا كرّارًا غير فرارٍ يحبّ اللهَ وَرَسُوْلَه۔ کبھی ملک کی صدا گوش زد ہوئی: لَا فَتٰى اِلَّا علىّ لَاسَيف اِلّا ذو الفقار۔ ان تذکروں کے علاوہ بس ہے توعبادت اورسخاوت کی مثالوں کا مشاہدہ یہ ہے سات آٹھ برس کا حسنؑ کا رسولؐ کی زندگی میں دورحیات۔

سات آٹھ برس کی عمر کے بچے چاہے معاملات میں عملی حصہ نہ لیں اورادب وحفظ مراتب کی بنا پر بزرگوں کے سامنے گفتگو میں بھی شرکت نہ کریں مگر وہ احساسات وتاثرات، جذبات اورقلبی واردات میں بالکل بزرگوں کے ساتھ شریک رہتے ہیں اوران کے دلوں کے اندر ولولوں کا طوفان بھی اٹھتا ہے۔ اورمنصوبوں کی عمارتیں بھی کھڑی ہوتی ہیں اوراس وقت کے تاثرات وتصورات کے نقوش اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ مٹانہیں کرتے۔

یقینا یہ اتنا زندگی کا دورامام حسنؑ کے دل ودماغ میں عام انسانی فطرت کے لحاظ سے ولولہ وہمت کی لہروں میں تموّج ہی پیدا کرنے والا تھا سکون پیدا کرنے والانہیں مگر اس سات آٹھ سال کے بعد ایک دم ورق الٹتا ہے اب یہ منظر سامنے ہے کہ باپ گوشہ نشیں ہیں۔ اورماں گریہ کناں۔ وہ تمام ناگوار حالات سامنے ہیں جن کا اظہار کسی کے لئے پسندیدہ ہے یا ناپسند۔ بہرحال تاریخ کے اندر وہ موجود اور ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں یقینا اگر حضرت علی بن ابی طالبؑ کا

دس برس کی عمر کے بعد ۱۳؍برس رسولؐ کے ساتھ رہ کر مکہ کی خاموش زندگی میں خاموشی کے راستے پر قائم رہنا ایک جہاد نفس تھا تو حسن مجتبیٰ کا بھی ۸؍برس کی عمر کے بعد پچیس سال باپ کے صبر و استقلال کے ساتھ ہم آہنگ رہنا ان کا ایک عظیم جہاد تھا وہاں علیؑ کے سامنے ان کے مربی رسولؐ کے جسم پر پتھر پھینکے جاتے تھے اور وہ خاموش تھے اور یہاں حسنؑ کے سامنے ان کے باپ علی بن ابی طالبؑ کے گلے میں رسی باندھی جاتی ہے اور مادر گرامی کے دروازے پر آگ لگانے کے لئے لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں اور انہیں ہر طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں اور حسن مجتبیٰ خاموش ہیں اسی خاموشی میں آٹھ برس سے اٹھارہ برس اور اٹھارہ برس سے اٹھائیس برس بلکہ سات آٹھ برس کی عمر کے بعد ۲۵؍سال میں تینتیس برس کے ہوئے مگر وہ جس طرح سات آٹھ برس کے بچپن کے دور میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ ایک کم عمر بچہ کی طرح تھے بالکل اسی شان سے اٹھارہ اور اٹھائیس اور تیس بتیس برس کی عمر کے جوان ہو کر بھی ہیں۔ مسلک ہے تو باپ کا، طریقۂ کار ہے تو باپ کا، نہ ان کے بچپن میں کوئی نادانی کا قدم اُٹھتا ہے نہ جوانی میں کوئی جوش کا اقدام اُٹھتا ہے پھر حضرت علیؑ نے خاموشی کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور امام حسنؑ تو آٹھ برس کی عمر اس جنگ کے ماحول میں گزار چکے تھے جس سے شجاعانہ اقدامات کو طبیعت میں رس بس جانا چاہئے اس کے بعد ۲۵؍سال اس طرح گزار رہے ہیں۔ اتنی طولانی مدت کے اندر کبھی جوش میں نہ آنا۔ اپنے ہم عمروں سے کبھی تصادم نہ ہونا، کسی دفعہ بھی ایسی کوئی بات نہ ہونا جو مصلحت علیؑ کے خلاف ہو۔ یہ ان کی زندگی کا کارنامہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تاریخ کی دھندلی نگاہ حرکت کو دیکھتی ہے سکون کو نہیں۔ آندھیوں کو دیکھتی ہے سناٹے کو نہیں۔ شورش طوفان دیکھتی ہے سمندر کے سکون پر نظر نہیں ڈالتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس دور کے فتوحات جو اکثریتی طاقت نے کئے جزو تاریخ بن گئے اور اسلام کی جو خدمت خاموش رہ کی گئی اور اس کے جو نتائج ہوئے وہ تاریخ میں کہیں نظر نہ آئیں گے بہر حال اب یہ ۲۵؍سال گزرے اور وہ وقت آیا جب حضرت علی بن ابی طالبؑ برسرِ اقتدار ہیں اس کے بعد جمل، صفین اور نہروان کے معرکے ہیں اور حضرت امام حسنؑ ان میں اپنے والد بزرگوار حیدر کرارؑ کے ساتھ ساتھ ہیں۔

حسنؑ کے ہاتھ میں جمل کی لڑائی میں تلوار اسی طرح پہلی بار ہے جس طرح بدر میں علیؑ کے ہاتھ میں پہلی بار۔ مگر جیسے انھوں نے پہلی ہی لڑائی میں شجاعانِ آزمودہ کار پر اپنی فوقیت ثابت کر دی ویسے ہی جمل میں جو کارنامہ دوسروں سے نہیں ہوتا وہ حسن مجتبیٰؑ اپنی تلوار سے کر کے دکھا دیتے ہیں۔

اسی طرح صفین میں ایسا معیاری نمونہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت امیرؑ اپنے فرزند محمد حنفیہؒ کے لئے اسے مثال قرار دیتے ہیں اور جیسا کہ دنیوی نے ''الاخبار الطوال'' میں لکھا ہے ایک ایسے موقع پر جب لشکر امیر المومنینؑ کے ایک بڑے حصہ نے شکست کھائی تھی، یہ اپنے باپ کے سامنے اس طرح تھے کہ انہیں تیروں سے بچا رہے تھے اور خود اپنے کو تیروں کے سامنے پیش کیے دیتے تھے۔

مخالف حکومت کا پروپگنڈا بھی کیا چیز ہے! اس نے

حکایتیں تصنیف کی ہیں کہ حسن مجتبیٰؑ تو طبعاً صلح پسند تھے۔ مگر ان کی بے جگری کے ساتھ ان نبرد آزمائیوں میں عملی شرکت ان تصورات کو غلط ثابت کر دیتی ہے۔

جنگ جمل میں کوفہ والوں کو ابوموسیٰ اشعری نے جو وہاں حاکم تھے نصرت امیرالمومنینؑ سے روک دیا تھا۔ یہ حسن مجتبیٰؑ ہی تھے جنہوں نے جا کر تقریر کی اور پورے کوفہ کو جناب امیرؑ کی نصرت کے لئے آمادہ کر دیا۔

ہاں جب صفین میں نیزوں پر قرآن اٹھائے گئے اور امیرالمومنینؑ نے حالات سے مجبور ہو کر معاہدۂ تحکیم پر دستخط کئے تو جوان سال بیٹے حسنؑ و حسینؑ دونوں باپ کے ساتھ اس معاہدہ میں بھی شریک تھے بالکل جس طرح حضرت امیر پیغمبرؐ خدا کے ساتھ ساتھ جنگ اور صلح دونوں میں۔ اسی طرح حسنؑ و حسینؑ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ہر منزل میں شریک نظر آتے ہیں۔

جب ۲۱ رمضان ۴۰ھ کو جناب امیرؑ کی وفات ہو گئی اور حضرت امام حسنؑ خلیفہ تسلیم کئے گئے تو آپ نے خود بھی حاکم شام کے خلاف فوج کشی کی۔ اور فوجوں کو لے کر روانہ بھی ہوئے اور اس طرح بھی ثابت کر دیا کہ راستہ آپ کا وہی ہے جو آپ کے والد بزرگوار کا راستہ تھا۔

اب اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حالات کی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل کوفہ کی اکثریت جنگ نہروان کے بعد سے جناب امیرؑ کے ساتھ ہی سرد مہری برتنے لگی تھی اور جنگ سے عاجز آچکی تھی جس پر خود حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اقوال جو نہج البلاغہ میں مذکورہ ہیں، گواہ ہیں اس کا علم حاکم شام کو بھی اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے ہو گیا تھا چنانچہ حضرت امیرؑ کے بعد انھوں نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے بہت سے روسائے کوفہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان لوگوں نے خطوط بھیجے کہ آپ عراق پر حملہ کیجئے اور ہم یہاں ایسی تدبیر کریں گے کہ حضرت امام حسنؑ کو قید کر کے آپ کے سپرد کر دیں۔

معاویہ نے یہ خطوط بجنسہٖ حضرت امام حسنؑ کے پاس بھیج دیئے۔ پھر بھی وہ جانتے تھے کہ حضرت امام حسنؑ کوئی ایسی صلح کبھی نہ کریں گے جس میں ان کے نقطۂ نظر سے حق کا تحفظ نہ ہو۔ اس لئے انھوں نے اس کے ساتھ ایک سادہ کاغذ بھیج دیا کہ جو شرائط آپ چاہیں اس پر لکھ دیں میں انھیں منظور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ان حالات میں جب کہ اپنوں کا حال وہ تھا اور مخالف یہ رویہ اختیار کر رہا تھا جنگ پر قائم رہنا ایک بلا وجہ کی ضد ہوتی جو آل رسولؐ کی شان کے خلاف تھی۔

حضرت پیغمبرؐ خدا نے تو حدیبیہ میں امن و امان کی خاطر مشرکین کے پیش کردہ شرائط پر صلح کی جسے سطحی نگاہ والے مسلمان سمجھ رہے تھے کہ یہ دب کر صلح ہے اور امام حسنؑ نے جو صلح کی وہ ان شرائط پر جو خود آپ نے پیش کئے تھے اور جنہیں فریق مخالف سے منظور کرایا۔

ذرا اس صلح نامہ کے شرائط میں نظر ڈالیے۔ اس کی مکمل عبارت علامہ ابن حجر مکی نے سوائق محرقہ میں درج کی ہے۔

اس میں شرط اول یہ ہے کہ حاکم شام کتاب وسنت پر عمل کریں گے اس شرط کو منظور کرا کے حضرت امام حسنؑ نے وہ اصولی فتح حاصل کی ہے جو جنگ سے حاصل ہونا ممکن نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ صلح نامہ کے شرائط میں بنیادی طور پر ایسی ہی چیز درج ہوتی ہے جو بنائے مخاصمت ہو۔ حضرت امام

حسنؑ نے یہ شرط لگا کر ثابت کردیا کہ ہماری بنائے مخاصمت معاویہ سے کوئی ذاتی یا خاندانی نہیں ہے بلکہ وہ صرف یہ ہے کہ ہم کتاب اور سنت رسولؐ پر عمل کے طلب گار ہیں اور یہ اس سے اب تک منحرف رہے ہیں۔ پھر صلح نامہ کی دستاویز تو فریقین میں متفق علیہ ہوا کرتی ہے وہ دونوں فریق اس کے کاتب ہوتے ہیں۔ یہ شرط درج کر کے امام حسنؑ نے حاکم شام سے تسلیم کرالیا کہ اب تک حکومت شام کا جو کچھ رویہ رہا ہے وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس شرط کی کیا ضرورت تھی؟

غلط اندیش دنیا کہتی ہے کہ امام حسنؑ نے بیعت کرلی۔ میں کہتا ہوں۔ اگر حقیقت پر غور کیجئے تو جب امام حسنؑ شریعت اسلام کے محافظ ہیں۔ اور آپ نے اس کا قرار حاصل کیا ہے کہ حاکم شام کتاب اور سنت کے مطابق عمل کریں گے تو اب یہ فیصلہ آسان ہے کہ جس نے شرائط مانے اس نے بیعت کی یا جس نے شرائط منوائے اس نے بیعت کی۔ حقیقت میں حضرت امام حسن نے تو بیعت لے لی۔ خود بیعت کی نہیں۔

دوسری شرط یہ تھی کہ تمہیں کسی کو اپنے بعد نامزد کرنے کا اختیار نہ ہوگا اس طرح حضرت امام حسنؑ نے بہ فرض مخالفت شرط اول اس ضرر کو جو حاکم شام کی ذات سے مذہب کو پہنچتا محدود بنایا اور آئندہ کے لئے یزید ایسے اشخاص کا سد باب کردیا۔

ہوا خواہان حاکم شام زیادہ نمایاں طور پر یہ شرط پیش کرتے ہیں کہ حضرت امام حسنؑ نے سالانہ ایک رقم مقرر کی تھی کہ یہ تمہیں ادا کرنا ہوگی میں کہتا ہوں کہ یہ شرط اگرچہ مسلّم نہیں ہے پھر بھی اگر یہ شرط رکھی ہو تو یہ آئینی حیثیت سے اپنے اصلی حقدار حکومت ہونے کے اعتراف کا فریق مخالف کے عمل سے قائم رکھنا ہے اور اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو حضرت رسولؐ خدا کا نصاریٰ سے جزیہ لے کر جنگ کو ختم کردینا درست ہے تو حضرت امام حسنؑ کا حاکم شام پر سالانہ ایک ٹیکس عائد کرنا بھی بالکل صحیح ہے یہ عملی مظاہرہ ہے اس کا کہ ہم نے دب کر صلح نہیں کی ہے بلکہ خونریزی سے بچنے کی ممکن کوشش کی ہے۔

حضرت امام حسنؑ کو اس صلح پر برقرار رہنے میں بھی کتنے شدائد اور زخم ہائے زبان کا مقابلہ کرنا پڑا ہے مگر مفاد دینی کے لئے یہ صلح ضروری تھی تو پُرجگری کے ساتھ حضرتؑ تمام ایذاء واہانت کے صدموں کو برداشت کرتے رہے۔ اور دس برس مسلسل پھر گوشہ نشینی کے ساتھ زندگی گزار کر حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ۲۵ رسال کے دورِ گوشہ نشینی کا مکمل نمونہ پیش کردیا۔

اموی ذہنیت والوں کا یہ پروپیگنڈا کہ حسن مجتبیٰؑ اپنے والد بزرگوار حضرت علی بن ابی طالبؑ اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت امام حسینؑ سے مختلف ذہنیت رکھتے تھے اور وہ صلح ان کی انفرادی افتادِ طبع کا نتیجہ تھی۔ خود اموی حاکم شامی کے عمل سے بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے اس طرح کہ اگر یہ بعد والا پروپیگنڈا صحیح ہوتا تو اس مصالحت کے بعد حاکم شام کو حضرت امام حسنؑ سے بالکل مطمئن ہوجانا چاہئے تھا بلکہ حاکم شام کی طرف سے واقعی پھر امام حسنؑ کی قدر و منزلت کے مسلمانوں میں بڑھانے اور نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی۔ بلاتشبیہ جس طرح مشہور روایات کی بنا پر جناب عقیل کو

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

ہونے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ بے دینی اضطراب انگیز ہے اور دین داری امن وامان اور اطمینان کا سامان۔

اگر فلسفیانہ رخ سے دیکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی اطمینان طلبی مذہب کی علت غائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی مذہب کا پابند اس لئے نہیں ہوتا کہ اسے سکون قلب کی دولت ملے بلکہ معتقد ہونے کے بعد اس میں یہ نفسیاتی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ سچا مذہبی شخص ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کا دل ساکن اور مطمئن ہوجاتا ہے۔ اسی لئے علم الاجتماع (Socology) اور علم النفس (نفسیات/Psychology) کے ماہرین اور تمام ان لوگوں نے مذہب اور دینی اعتقادات کی طرف افراد انسانی کو دعوت دی ہے جو اس خشک اور بے روح دنیا میں انھیں اضطراب، بے چینی اور درد دکھ سے نجات دینا چاہتے ہیں۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ مغربی دنیا کو جس اطمینان طلب کی خواہش ہے وہ اسے مسیحیت کی پیروی میں ملے گا یا نہیں؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کی اس اطمینان طلبی کا سرچشمہ خالص مادی تفکر اور دنیا پرستی ہے۔ بے شک مذہب انسان کو اطمینان دیتا ہے لیکن نہ وہ اطمینان کہ جس کے سائے میں انسان بغیر کسی دغدغہ کے اپنے مطلق العنان سرکش جنسی میلانات کو زیادہ سے زیادہ پورا کرے اور اپنے بے روح معنویت سے محروم زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھائے۔

مذہب انسان کو اطمینان قلب اور سکون نفس دیتا ہے لیکن ایسا اطمینان وسکون جس میں زندگی کے معنوی پہلو مادی گوشوں پر تفوق رکھتے ہیں۔ ایسا سکون واطمینان جس میں آزادی اور مطلق العنانی نہیں ہے بلکہ انسان کے کاندھوں پر احکام مذہبی کی تعمیل کا بوجھ ہے۔ ☆☆☆

بقیہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

حضرت علی بن ابی طالبؑ سے بظاہر جدا کرنے کے بعد ان کی خاطر داریوں میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا جاتا تھا۔ یہی بلکہ اس سے زیادہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ صلح کرنے کے بعد بھی امام حسنؑ کو آرام اور چین نہیں لینے دیا گیا اور بالآخر زہر دغا سے آپ کو شہید کردیا گیا۔ اسی سے ظاہر ہے کہ حاکم شام بھی جانتے تھے کہ یہ رائے، مسلک، خیال اور طبیعت کسی اعتبار سے بھی اپنے باپ بھائی سے جدا نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت انہیں فرض کا تقاضا یہی محسوس ہوا لیکن اگر مصلحت دینی میں تبدیلی ہوتو یہی کوئی نیا صفین کا معرکہ پھر آراستہ کرسکتے تھے اور انہیں کے ہاتھ سے کربلا بھی سامنے آسکتی ہے اسی لئے ان کی زندگی اس کے بعد بھی ان کے سیاسی مقاصد کے لئے خطرہ بنی رہی اور جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو انھوں نے اطمینان کی سانس ہی نہیں لی بلکہ اپنے سیاسی ضبط وتحمل کے دائرے سے بھی تجاوز کرکے بالاعلان انھوں نے مسرت سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حسن مجتبیٰؑ کی صلح کسی مخصوص ذہنیت یا طبیعت کا نتیجہ نہیں تھی، وہ صرف فرض کے اس احساس کا تقاضا تھی جو انسانی بلندی کی معراج ہے۔ ☆☆☆